بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مشاورت اور تیسیر

اسوۂ حسنہ سے ماخوذ دو اہم اصول

محمد یوسف فاروقی

مشاورت

قرآن کریم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ تمام تر مکارم اخلاق پر مبنی ہے۔ آپ ﷺ کی راہ میں کتنی ہی بڑی رکاوٹ یا مشکل کیوں نہ پیش آجائے، اللہ کے رسول ﷺ اخلاق کے بلند تر مقام سے کبھی نیچے نہیں آتے۔ اسی کی گواہی قرآن حکیم دیتا ہے:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ○ (۱)

اور یقیناً آپ اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔

اخلاقِ حسنہ اسوۂ حسنہ کا جزو لاینفک ہے۔ یہ رسول ہی کا مقام ہے کہ وہ حالتِ جنگ میں ہوں یا ایسے وقت میں جب دشمن قتل کے ارادے سے آپ ﷺ کے گھر کا گھیراؤ کر لے اور ارادۂ قتل سے تمام حدود کو پامال کر دے، رسول ﷺ پھر بھی اخلاقی اقدار اور اصولوں سے سرمو انحراف نہ کریں۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو سب سے بہتر جامع انداز میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ سراپا قرآن حکیم کی عملی تعبیر اور تفسیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اہل علم اور فقہائے کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو اسلامی فکر، تہذیب اور قانون کا ایک اہم ماخذ و مصدر قرار دیتے ہیں۔

شوریٰ بھی اسوۂ حسنہ کا ایک اصول ہے۔ اس مقالے میں پہلے اہم اسوۂ حسنہ کے حوالے سے اس اصول پر روشنی ڈالیں گے اور سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ اسلام کے اجتماعی نظام میں شوریٰ کی حیثیت و اہمیت کیا ہے۔

مشورے کا لفظ دراصل شار العسل سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے شہد کی مکھی کے چھتے سے شہد نکالنا۔ جس طرح چھتے سے شہد کو بڑی مہارت، صفائی اور احتیاط سے نکالا جاتا ہے، اسی طرح مشاورت کے ذریعے متعدد آرا میں سے مفید اور قابل عمل رائے کو بہت ذہانت وبصیرت کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے۔ اور جس طرح شہد صحت بخش اور حیات آفریں غذا ہے، اسی طرح شوریٰ بھی معاشرے، مملکت اور نظم زندگی کے لیے جام حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں شوریٰ کا اصول بہت مستحکم اور منظم نظر آتا ہے۔ آپ ﷺ تمام ان امور میں جن میں وحی الٰہی کی جانب سے رہ نمائی نہ دی گئی ہو، اپنے صحابۂ کرامؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی کثرت مشاورت کو حضرت ابو ہریرہؓ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

مارأیت احدا أکثر مشاورۃ لاصحابہ من رسول اللہ ﷺ (۲)

میں نے کوئی اور شخص ایسا نہیں دیکھا جو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ اپنے اصحاب سے مشورہ کرتا ہو۔

ابن جریر الطبریؒ اور جار اللہ زمخشریؒ نے رسول اللہ ﷺ کی اس روایت کو نقل کیا ہے، جس میں آپ ﷺ نے مشاورت کی اہمیت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

ما تشاور قوم قط الا ھدوا لأ رشدامرھم (۳)

لوگ جب کبھی کسی معاملے میں باہم مشورہ کرتے ہیں تو انہیں ضرور معاملے کی بہتر صورت کی جانب رہ نمائی کر دی جاتی ہے۔ (۳)

یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

ماخاب من استخار وماندم من استشار (۴)

استخارہ کرنے والا نامراد نہیں ہوتا، اور مشورہ کرنے والے کو شرمندگی اٹھانا نہیں پڑتی۔

اس روایت پر غور کیجیے۔ یہاں دو اہم چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر کے بیان کیا گیا ہے۔ ایک استخارہ ہے اور دوسری چیز شوریٰ ہے۔ استخارے کا تعلق فرد سے ہے اور شوریٰ کا تعلق معاشرے اور ملت سے ہے۔ استخارے کی صورت بھی ایک طرح عاجزانہ مشورے کی ہے، جس میں ایک فرد اپنے رب عالم الغیب والشہادہ سے اپنے کسی اہم معاملے میں دعا کی صورت میں عاجزانہ درخواست کرتا ہے کہ اگر زیر غور معاملہ میرے دین، میرے معاش اور انجام کار کے لیے بہتر ہے تو اسے میرے لیے مقدر فرما دے، اور اگر یہ چیز علم الٰہی میں میرے دین، میرے معاش اور میرے انجام کار کے لیے مضر ہو تو مجھے

اس سے محفوظ رکھ اور میرے لیے خیر کو مقدر فرمادے۔

استخارے کی پوری مسنون دعا پر غور کیجیے، یہ فرد کی تربیت کا ذریعہ ہے۔ اس میں فرد مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی رضا کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کرتا ہے، اس میں عاجزی وانکساری کا اظہار ہے۔ جب کہ شوریٰ ہماری اجتماعی تربیت کا ارادے ہے۔ شوریٰ اگر اسلامی تعلیمات اور ہدایات کے مطابق ہو تو اس کی وجہ سے باہمی تعاون، اتحاد اور الفت ومحبت پیدا ہوتا ہے۔ ابوحیان نے آیت شوریٰ کی تفسیر کرتے ہوئے ان ہی فوائد کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ شوریٰ کے تین فوائد کو ذکر کرتے ہیں:

ایک اجتماع الکلمہ، یعنی شوریٰ باہمی اتحاد واتفاق پیدا کرتا ہے۔

دوسرا فائدہ التحاب، یعنی باہم الفت ومحبت کا سبب ہوتا ہے۔

اور تیسرا فائدہ یہ ہے التعاضد علی الخیر یعنی بھلائی اور ترقیاتی کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ (۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو بہت جامع انداز میں ایک جملے میں سمیٹ کر بیان فرما دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

الدین النصیحة

یعنی دین تو سراسر خیر خواہی اور نصیحت کا نام ہے۔ پوچھا گیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! خیر خواہی کس کے ساتھ؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ، اس کی کتاب، اس کے رسول، مسلم امہ کے قائدین اور عام لوگوں کے ساتھ۔ (۶)

حضرت جریر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اس بات کی بیعت کی کہ میں ہر مسلمان کے لیے خیر خواہی کا جذبہ رکھوں گا۔ (۷) اس حدیث نے بڑی جامعیت کے ساتھ مملکت اور معاشرے کے تمام لوگوں کا احاطہ کرلیا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخلص ہوتا ہے، وہی اس کی مخلوق کے ساتھ بھی مخلص ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہماری زندگی کا دستور حیات ہے۔ لہٰذا کامیاب زندگی گزارنے کے لیے کتاب اللہ کے ساتھ مخلص ہونا بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسول پر ہمارا ایمان غیر مشروط ہے۔ ان کی زندگی ہمارے لیے اسوہ حسنہ ہے۔ اسوہ حسنہ کی پیروی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے مخلصانہ تعلق کے بغیر ممکن نہیں۔ نظم مملکت وحکومت اور اجتماعی وحدت کے استحکام کا دارومدار اس بات پر ہے کہ لوگ ان کے ساتھ سنجیدہ اور مخلص ہوں اور پھر اخلاص وہم دردی وخیر خواہی کا دائرہ اس قدر وسیع ہوجائے کہ عامۃ الناس بھی اس سے منتفع ہونے لگیں۔ شوریٰ کو اگر اس کی صحیح

روح کے ساتھ قائم کیا جائے تو یہ تمام فوائد ضرور حاصل ہوں گے۔

اسوۂ حسنہ سے شوریٰ کی مثالیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرامؓ سے بہ کثرت مشورہ کیا کرتے تھے۔ مشورے کے سلسلے میں یہ بات اصولی طور پر طے شدہ تھی کہ مشورہ صرف ان امور میں کیا جاتا تھا، جن کے بارے میں وحی الٰہی کے ذریعے رہ نمائی نہ کی گئی ہو۔ جن معاملات میں وحی موجود ہوتی تھی، ان پر وحی کے مطابق عمل کیا جاتا تھا۔ مشاورتی امور کا دائرہ تقریباً تمام شعبوں کو محیط تھا۔ اگر کسی معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محسوس فرماتے کہ یہاں وحی کے ذریعے ہی رہ نمائی ملنا چاہیے تو وہاں رسول اللہ ﷺ وحی کا انتظار فرماتے، اور نزولِ وحی پر اس کے مطابق عمل فرماتے۔ اس مقالے میں ہم چند اہم امور میں آپ ﷺ کے مشاورتی فیصلوں پر بحث کریں گے۔

ہمارے سیرت نگاروں نے جہاد اور دفاع سے متعلق امور میں مشاورت کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ غزوۂ بدر کو اسلامی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے صحابہؓ کے ساتھ بدر کے مقام پر پہنچے تو آپ ﷺ نے ایک جگہ کا انتخاب فرما کر اپنے لشکر کو وہاں پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حباب بن المنذر نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس جگہ کا انتخاب آپ ﷺ نے وحی کی بنیاد پر کیا ہے یا یہ آپ کی رائے اور ایک جنگی تدبیر ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ یہ فیصلہ وحی کی بنیاد پر نہیں، بل کہ یہ رائے اور ایک جنگی تدبیر ہے، اس پر حباب بن المنذر نے کہا: پھر میری رائے میں یہ جگہ زیادہ مناسب نہیں، ہمیں اپنے لشکر کے پڑاؤ کے لیے آگے جا کر اس جگہ کا انتخاب کرنا ہوگا، جہاں پانی کے چشموں پر ہمارا قبضہ ہو، تا کہ ہمارے مجاہدین کو پانی کی کمی نہ ہو۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لقد أشرت بالرأی

تم نے بہت اچھا مشورہ دیا۔

پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھیں اور اسی جگہ پڑاؤ ڈالیں، جس جگہ کا مشورہ حباب بن المنذر نے دیا ہے۔ (۸)

اس واقعے کا غور سے مطالعہ کیجیے اور اس سارے معاملے کا تجزیہ کیجیے تو شوریٰ سے متعلق کئی پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ اس کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ صحابۂ کرام رسول اللہ ﷺ کو مشورہ دینے میں کوئی

جھجک محسوس نہیں کرتے تھے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے صحابہؓ سے بہت قریبی اور بے تکلفانہ تعلقات تھے کہ انہیں مشورہ دینے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی تھی، نیز آپ ﷺ کی جانب سے صحابہ کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی کہ وہ جہاں کہیں ضرورت محسوس کریں، آپ ﷺ کو ضرور مشورہ دیں، جب کبھی کوئی اچھا مشورہ دیا جاتا تو رسول اللہ ﷺ اس کی تعریف فرماتے۔ اس موقع پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حباب بن المنذر کی ان الفاظ میں حوصلہ افزائی فرمائی: لقد اشرت بالرأی (تم نے واقعی بہت اچھا مشورہ دیا)۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ بعد میں آنے والے قائدین اور حکمرانوں کے لیے اس میں ایک اہم سبق ہے، وہ یہ کہ اگر کسی معاملے میں حکمران کوئی رائے قائم کرلیں یا کوئی فیصلہ کرلیں اور پھر اس کے خلاف کوئی بہتر رائے آجائے تو وہ انا کا مسئلہ بنائے بغیر خوش دلی سے قبول کرلیں۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں، مثلاً غزوۂ احد میں مدینہ منورہ کا دفاع شہر کے اندر رہ کر کیا جائے یا باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔ اسی طرح غزوۂ احزاب کے موقع پر جب مدینہ منورہ کا محاصرہ طویل ہوگیا تو آپ ﷺ نے مسلمانوں پر گھیراؤ کی وجہ سے دباؤ کم کرنے کے لیے یہ سوچا کہ قبیلہ غطفان کو کھجور کی پیداوار کا کچھ حصہ دے کر انہیں اس بات پر تیار کرلیا جائے کہ وہ عربوں کی متحدہ افواج سے الگ ہو جائیں۔ ان کے الگ ہونے کا اثر تمام متحدہ افواج پر پڑے گا۔ اس طرح اس محاصرے کو توڑنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے پر انصار کے قائدین سے مشورہ کیا تو انہوں نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا، بل کہ آخر وقت تک لڑنے اور مدینہ منورہ کا دفاع کرنے کا عزم ظاہر کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے عزم و حوصلے کو دیکھتے ہوئے ان کی رائے کو قبول فرمایا اور قبیلہ غطفان کے ساتھ معاہدے کا ارادہ ترک کردیا۔

غزوۂ خندق کے موقع پر جب سارے عرب کی اسلام مخالف قوتیں متحد ہو کر مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کے ارادے سے مدینہ منورہ کی جانب روانہ ہوئیں تو شہر مدینہ کے دفاع کا مسئلہ پیدا ہوا اور یہ طے کیا گیا کہ مدینہ منورہ کا دفاع شہر کے اندر رہ کر کیا جائے، لیکن اہم مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ دشمن کی فوج کو شہر کے اندر داخل ہونے سے کیسے روکا جائے۔ اس موضوع پر مختلف رائے آئیں، لیکن حضرت سلمان فارسی کے مشورے کو قبول کیا گیا۔ ان کا مشورہ یہ تھا کہ دشمن کو شہر سے باہر روکنے کے لیے شہر کے اطراف میں خندق کھود دی جائے، جو اس قدر چوڑی اور گہری ہو کہ دشمن اسے عبور نہ کرسکے۔ سلمان فارسیؓ نے یہ بھی بتایا کہ دفاع کا یہ طریقہ فارس میں رائج ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشورے کو قبول فرما کر

مدینہ منورہ کے اطراف میں خندق کھودنے کا حکم جاری فرمایا۔(۹)

اس شورائی واقعے کا تجزیہ کیجیے تو اس میں اسوۂ حسنہ کا ایک نیا پہلو نظر آتا ہے، وہ یہ کہ مشاورت میں مختلف اقوام کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے اس مسئلے پر متفق ہوکر غزوۂ احزاب میں فائدہ اٹھایا۔ مشاورتی مجلس میں ایک اصولی ہدایت کو پیش نظر ضرور رکھا جاتا تھا اور وہ یہ کہ رائے دین کی بنیادی فکر اور اصولی ہدایات کے خلاف نہ ہو، بل کہ حکمت ودانائی اور اسلامی آداب واخلاق کے دائرے میں ہو۔

حکمت ودانائی کے بارے میں ہمیں رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے بڑی رہ نمائی ملتی ہے:

الکلمة الحکمة ضالة المؤمن حیثما و جدها فهو احق بها (۱۰)

حکمت کی بات تو مومن کا گم کردہ سرمایہ ہے، لہٰذا وہ جہاں کہیں سے ملے، مومن اس کا زیادہ حق دار ہے۔

سن آٹھ ہجری میں جب مسلمان مجاہدین نے طائف کا محاصرہ کیا اور مسلمانوں کو وہاں کام یابی حاصل ہوئی تو اس کے نتیجے میں قبیلہ ہوازن اور ثقیف کے بہت سے لوگ بہ طور جنگی قیدی گرفتار ہوکر مسلمانوں کی قید میں آئے۔ اختتام جنگ کے بعد قبیلہ ہوازن کے بعض نمائندے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے اپنے جنگی قیدیوں کی رہائی کی درخواست کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف کے ان قبائل کے مقام ومرتبے سے واقف تھے، نیز طائف کی جغرافیائی حیثیت کو بھی سمجھتے تھے، سب سے اہم بات یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام معاملات میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کو ترجیح دیا کرتے تھے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ کی ذاتی رائے تو یہ تھی کہ ہوازن کے لوگوں کے ساتھ احسان کا سلوک کیا جائے۔ اس اصول کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ جو جنگی قیدی میرے قبضے میں ہیں، انہیں تو میں بہ خوشی آزاد کرتا ہوں، لیکن جو دوسروں کے پاس قید ہیں، ان کے بارے میں آپ لوگ یہ طریقہ اختیار کریں کہ نماز ظہر میں آپ لوگ مسجد میں آجائیں اور وہاں سب کے سامنے یہ درخواست رکھیں۔ ہوازن کا وفد پروگرام کے مطابق نماز ظہر میں مسجد میں آگیا۔ نماز کے بعد انہوں نے اپنی درخواست رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کی، ان کی درخواست پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں موجود تمام لوگوں کے سامنے فرمایا کہ جو جنگی قیدی میرے پاس ہیں یا جو بنو عبدالمطلب کے پاس ہیں، انہیں میں بہ خوشی تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ سن کر مہاجرین نے کہا کہ جو قیدی ہمارے قبضے میں ہیں، ہم انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کرتے ہیں۔ انصار نے بھی اسی

جذبے کا اظہار کیا، البتہ ان میں کچھ ایسے لوگ تھے، جو ابھی نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے، اور اسلام کی اعلیٰ اخلاقی قدروں سے پوری طرح واقف نہیں تھے، نہ ہی اخلاقِ کریمہ ان کے مزاج اور رویوں میں اچھی طرح رچے بسے تھے، یہ لوگ تذبذب کا شکار ہو گئے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جن میں نفاق پایا جاتا تھا، انہوں نے قیدیوں کو آزاد کرنے سے انکار کیا، جس کی وجہ سے مسجد میں عجیب سا ماحول پیدا ہو گیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

انی لا ادری من اذن فیکم ممن لم یأذن، فارجعوا حتی یرفع الینا عرفائکم امرکم، فرجع الناس، فکلمهم عرفاء هم، فرجعوا الی رسول الله ﷺ فاخبروه أن الناس قد طیبوا واذنوا (۱۱)

مجھے نہیں معلوم کہ کس نے اپنے قیدیوں کی آزادی کی بہ خوشی اجازت دی ہے اور کس نے نہیں دی، لہٰذا اب آپ لوگ جائیں اور اپنے عریفوں (نمائندوں) کو بھیجیں، تاکہ وہ تمہارے معاملے کو ہمارے سامنے پیش کریں۔ یہ سن کر لوگ چلے گئے، انہوں نے اس معاملے پر اپنے عریفوں سے بات کی۔ پھر ان کے عریفوں نے آ کر رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ لوگوں نے اپنی رضامندی اور خوشی سے اجازت دی ہے۔

اس سارے مشاورتی عمل سے ہم یہ استدلال کر سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے بہ راہِ راست یا بلا واسطہ مشاورت بھی کی اور بالواسطہ مشاورت کر کے اس کے جواز کی مثال بھی قائم کر دی، اسی مثال سے ہمیں عوامی نمائندگی کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ (۱۲)

جنگی قیدیوں کی رہائی کا مسئلہ عہدِ رسالت میں بہت سے سیاسی و معاشرتی مضمرات کا حامل تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موضوع پر بہ راہِ راست لوگوں سے مشورہ کیا، اس لیے کہ جنگی قیدی کسی سرکاری جیل یا کیمپ میں نہیں تھے، بل کہ اس زمانے کے رواج کے مطابق عام لوگوں کی قید میں تھے، اس لیے آپ ﷺ نے پہلے معاملہ عام لوگوں کے سامنے رکھا، لیکن بعد میں اس مسئلے کو نمائندوں کے ذریعے حل کیا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہاں سب سے اہم کام پنج وقتہ اقامتِ صلوٰۃ اور تعمیرِ مسجد کا مسئلہ تھا۔ شروع میں پانچوں وقت نمازوں کے اوقات پر مدعو کرنے کا کوئی خاص اہتمام نہیں تھا۔ اذان کا موجودہ طریقہ بھی رائج نہیں تھا۔ لوگ خود ہی اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ مقررہ اوقات پر مسجد پہنچ جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ نمازوں کے لیے مسجد

میں لوگوں کو جمع کرنے کے لیے ہمیں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ ابن ماجہؒ نے حضرت سالم سے روایت نقل کی ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم استشار الناس لما یھمھم الی الصلوٰۃ (۱۳)

رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے مشورہ کیا کہ لوگوں کو نماز کے لیے بلانے اور جمع کرنے کا کیا طریقہ ہونا چاہیے۔

مشورے کے نتیجے میں بہت سی آرا سامنے آئیں۔ ایک رائے یہ تھی کہ نمازوں کے اوقات میں مسجد میں بلندی پر ایک جھنڈا لہرا دیا جائے، لوگ جھنڈے کو دیکھ کر مسجد میں آجایا کریں گے۔ ایک رائے یہ آئی کہ بوق یا قرن (سنکھ) بجا دیا جائے۔ یہ طریقہ یہودیوں کا تھا، وہ اپنی عبادات کے لیے سنکھ بجایا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو دونوں آرا پسند نہیں آئیں، تیسری رائے یہ تھی کہ نمازوں کے وقت پر ناقوس بجا دیا جائے۔ ناقوس بجانے کا طریقہ عیسائیوں کے ہاں رائج تھا۔ یہ رائے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہیں آئی لیکن مختلف روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید وقتی طور پر یہ ارادہ ہوا کہ ایک ناقوس بنوالیا جائے۔ اسی غور وفکر کے دوران حضرت عبداللہ بن زیدؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ! آج رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں بیت اللہ کا طواف کر رہا ہوں۔ میرے قریب سے ایک شخص دوران طواف گزرا، جو دو سبز چادروں میں ملبوس تھا، اس کے ایک ہاتھ میں ناقوس تھا۔ میں نے اس شخص سے کہا کہ اے بندۂ خدا! یہ ناقوس تو تم مجھے فروخت کردو، اس شخص نے پوچھا: کیا کرو گے؟ میں نے اس سے کہا کہ ہم اسے نمازوں کے اوقات میں مسجد کی طرف لوگوں کو بلانے کے لیے استعمال کریں گے۔ اس شخص نے کہا کہ کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز نہ بتادوں۔ میں نے کہا: ضرور بتایئے، تو اس نے مجھے اذان کے یہ الفاظ اللہ اکبر، اللہ اکبر..... سکھائے۔ یہ الفاظ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: انھالرؤیا حق، یہ تو سچا خواب ہے۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ اذان دیں۔ حضرت بلالؓ نے اذان شروع کی تو اللہ اکبر کی آواز سنتے ہی حضرت عمرؓ تیزی سے مسجد میں تشریف لائے اور فرمایا کہ یارسول اللہ! یہی اذان مجھے بھی خواب میں سکھائی گئی ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فللّٰہ الحمد کہ ہم اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے ہیں کہ اس نے ہمیں بہتر راہ سمجھا دی۔ (۱۴) اب اذان کے وہی کلمات ہیں، جو عہد رسالت سے لے کر آج تک ساری مسلم دنیا میں دہرائے جاتے ہیں۔

اقامتِ صلوٰۃ دین کا ایک اہم اور بنیادی ستون ہے۔ پنج وقتہ نمازوں کے اعلان کے مسئلے پر مشاورت اور بحث سے متعلق روایات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشاورت اور باہمی غور وفکر کا

سلسلہ کئی دن جاری رہا (ہفتہ دس دن جاری رہا ہوگا)۔ اس دوران مختلف تجاویز زیرِ غور آتی رہیں، مگر ایک اچھی اور قابلِ عمل تجویز کی تلاش رہی۔ اس مسئلے میں اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی۔ اور بعض صحابہ کرامؓ نے جو کچھ خواب میں دیکھا تھا، مشاورت میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے اسی کو قبول کر لیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی رائے اچھے خواب سے اخذ کی جائے اور وہ حکمت و مصلحت پر مبنی ہو اور امت کی ضرورت بھی بہتر طریقے سے پوری کرتی ہو تو اسے قبول کیا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک فقہی مسئلے کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ کسی فرد کا خواب دوسروں کے لیے حجت نہیں ہوتا۔ اذان کے واقعے میں دو صحابیوں کے خواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی جانب سے بالاتفاق قبول کرنے اور اس کے مطابق حکم نافذ کر دینے کی وجہ سے سنت کا درجہ حاصل کر گیا، اور سنت فقہ اسلامی میں حجت کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی طرح صحابہ کرامؓ کا اجماع بھی حجت ہے، لہٰذا اب اذان کے الفاظ اور نمازوں کے اوقات پر مسجد میں بلانے کا جو طریق کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ نے بالاتفاق طے کر دیا ہے، اس سے نہ انحراف کیا جا سکتا ہے، نہ ہی ان الفاظ کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا صفحات میں ہم نے شوریٰ کی چند مثالوں پر بحث کی ہے، ان میں سے بعض کا تعلق ملک کے دفاع اور دفاعی حکمت عملی سے ہے۔ بعض کا تعلق معاشرتی اور سیاسی امور سے ہے، آخری واقعے کا تعلق خالص عبادت سے ہے، لیکن ان تمام امور کا تعلق دینی امور سے ہے، اس لیے کہ دین کا دائرہ زندگی کے تمام پہلوؤں اور شعبوں کو محیط ہے۔ مقالے کی طوالت کے پیشِ نظر ہم نے اور بے شمار شورائی فیصلوں اور واقعات کو چھوڑ دیا ہے۔ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندگی میں تمام اجتماعی امور میں فیصلے باہمی مشاورت سے فرمایا کرتے تھے، مندرجہ بالا مثالیں کافی ہیں۔

ان ہی مثالوں میں رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی جھلک بھی واضح ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر اجتماعی مشاورت کے سلسلے میں آپ کا عمل اور آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ قرآن حکیم کی عملی تعبیر و تشریح ہے۔

قرآن حکیم میں صراحت کے ساتھ دو جگہ شوریٰ کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ پہلا حکم جس سورۃ میں مذکورہ ہے، اس کا نام الشوریٰ ہے۔ اس سورت کی وہ آیات جن میں شوریٰ کا ذکر ہے، مکی دور کے آخری زمانے میں اس وقت نازل ہوئیں، جب امتِ مسلمہ علمی، فکری اور اخلاقی طور پر ایک منظم جماعت کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس جماعت کے شورائی طرزِ عمل کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ O

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ص وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ص وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ (۱۵)

اور وہ کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔ اور وہ اپنے رب کا حکم مانتے اور نماز قائم کرتے ہیں اور ان کا ہر کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے، وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

ہم نے صرف وہ آیت بیان نہیں کی، جس میں شوریٰ کا ذکر ہے، بل کہ سیاق وسباق کو سمجھنے کے لیے اس سے پہلی آیت کو بیان کر دیا ہے۔ پہلی آیت میں وہ تین اصطلاحات ذکر کی گئی ہیں، جو اپنے اندر ساری معاشرتی برائیوں اور جرائم کو سمیٹ لیتی ہیں۔ ایک کبائر الاثم ہے، اس میں وہ تمام جرائم داخل ہیں جو ناانصافی، ظلم یا کسی کی حق تلفی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ الفواحش، جمع کا صیغہ ہے۔ اس میں وہ تمام جرائم داخل ہیں جو شہوات، بے حیائی اور خواہشات نفس کی وجہ سے ابھرتے ہیں اور تیسری اصطلاح غضب ہے۔ یہ برائی تکبر، انانیت اور خودسری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اور معاشرے میں سرکشی، بغاوت اور فتنہ و فساد اور جبر کو جنم دیتی ہے۔ (۱۶)

اس وضاحت کے ساتھ دونوں آیات مبارکہ کے اسلوب اور ترکیب پر غور کیجیے، ایک واضح پیغام نظر آئے گا۔ وہ یہ کہ امتِ مسلمہ کے اجتماعی نظم میں شوریٰ کی کام یابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ عام لوگوں کا علمی وفکری معیار بہتر ہو۔ اخلاقی رویہ درست ہو۔ ان میں تحمل اور برداشت کا مادہ مضبوط ہو، ایک دوسرے کے ساتھ عفو و درگزر سے پیش آتے ہوں، قانون کو بالادستی حاصل ہو۔ ایسے معاشرے میں شورائی نظام قائم کیا جائے تو وہ ایک کام یاب نظام کے طور پر معاشرے کو اچھے اور مفید ثمرات سے نوازتا ہے۔ مہذب اور تعلیم یافتہ معاشرے میں شورائی نظام معاشرے اور مملکت دونوں کے استحکام کا ذریعہ بنتا ہے اور دونوں کو ترقی کی راہ پر گام زن کر دیتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرامؓ کا علمی، فکری اور اخلاقی معیار تعلیم وتربیت اور تزکیہ نفس کے ذریعے بہت بلند کر دیا تھا۔ ان کی علمی وفکری صلاحیتیں مسلسل اجاگر ہو رہی تھیں۔ ان کے کردار اور رویوں میں استحکام تھا، ان کے سامنے مشن اور مقاصد واضح تھے۔ اس لیے شورائی نظم نے معاشرے کے ارتقائی مراحل میں بہت موثر کردار ادا کیا۔

شوریٰ سے متعلق دوسری آیت ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔ آیت مبارکہ درج ذیل

ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (۱۷)

یہ تو اللہ ہی کی رحمت ہے کہ جو آپ ان کے لیے نرم دل ہیں، اور اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے، سو آپ ان کو معاف کر دیجیے اور ان کے لیے بخشش مانگیے اور کام میں ان سے مشورہ بھی کر لیا کیجیے، پھر جب آپ پختہ عزم کر لیں تو اللہ پر بھروسا کیجیے، بے شک اللہ بھروسا کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں غور کیجیے تو اس میں بھی اعلیٰ اخلاقی قدروں کی بالادستی کو کامیاب اجتماعیت، ملی اتحاد اور شورائی نظم کے لیے بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات صاف صاف بتا دی ہے کہ اگر حکمران اور قائدین میں عفو و درگزر کا جذبہ نہ ہو، وہ صبر و تحمل سے کام نہ لیں تو ان کا یہ رویہ انتشار کا باعث ہو سکتا ہے۔ آیت مبارکہ میں محض عفو و درگزر کا حکم نہیں دیا گیا، بل کہ اپنے لوگوں کے لیے دعائے خیر اور استغفار کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ اس پر خلوص تعلق کے بعد حکم دیا گیا ہے کہ ان کے ساتھ ملت و مملکت کے معاملات میں مشورہ بھی کیجیے، اور پھر مشورے کے نتیجے میں جو عزم پیدا ہو، اس کے مطابق اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کرتے ہوئے کر گزریے۔ (۱۸)

ہم نے اس مقالے میں شوریٰ کی چند متفرق مثالیں اسوۂ حسنہ سے بیان کی ہیں۔ شوریٰ کے ان نظائر سے نہ صرف اس کا وجود، بل کہ بہ حیثیت ادارہ اس کا وجوب بھی ثابت ہوتا ہے۔ اس ادارے کا تسلسل خلفائے راشدین کے دور میں بھی جاری رہا۔ خلفائے راشدین کے عہد سے شوریٰ کے نظائر پر بحث سے یہ مقالہ طوالت اختیار کر جائے گا، اس لیے ہم سنن دارمی کی صرف ایک روایت پر ہی اکتفا کریں گے۔ امام دارمیؒ نے مہران بن میمون کی روایت نقل کی ہے، جس میں وہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے فیصلوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ جب کبھی ان کے سامنے کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا تو وہ سب سے پہلے قرآن حکیم میں اس کا حکم تلاش کرتے، اگر قرآن حکیم میں اس کا حکم مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیا جاتا۔ اگر قرآن حکیم اس مسئلے میں خاموش ہوتا تو پھر سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے، سنت میں اگر اس کا حل مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیا جاتا اور اگر ان کے اپنے علم کی حد تک قرآن و سنت میں حل نہ ملتا تو پھر مسجد نبوی میں صحابہ کرامؓ کو جمع کر لیا جاتا اور ان سے پوچھا جاتا کہ کسی

کے علم میں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فرمان موجود ہو تو وہ پیش کردے، تاکہ اس کے مطابق فیصلہ کردیا جائے، اور اگر زیر غور مسئلے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث نہ ملتی تو پھر اس کے بارے میں مشورے کیا جاتا اور جو کچھ مشورے میں طے ہوجاتا، اس کے مطابق فیصلہ کردیا جاتا۔ (۱۹)

خلفائے راشدین کے انتخاب کا مسئلہ ہو یا جمع و تدوین قرآن کا، کیلنڈر کے تعین کا معاملہ ہو یا مجاہدین میں تقسیم اراضی کا، تمام اہم مسائل خلفائے راشدین کے عہد میں باہمی مشوروں سے طے کیے گئے۔

جہاں تک نفس شوریٰ کا تعلق ہے تو یہ شرعاً واجب ہے، امت کے اجتماعی امور بغیر شوریٰ کے طے نہیں کیے جاسکتے، البتہ شوریٰ کا طریق کار اور منہج شریعت نے ہر دور اور زمانے کے اہل حل وعقد پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے دور کے حالات اور ضرورت کے مطابق باہم مشورے سے طے کرلیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دور کا طے کردہ طریق کار کسی بدلے ہوئے زمانے میں قابل عمل نہ رہے۔ شریعت تو ایک اصولی ہدایت دے دیتی ہے، اس اصولی ہدایت پر عمل کا مناسب طریق کار لوگ خود تلاش کرلیتے ہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ بعض معاملات بہت فنی، علمی، دستوری یا قانونی ہوتے ہیں، ایسے امور میں متعلقہ فن یا علم کے ماہرین کا مشورے میں شریک ہونا ضروری ہے۔ کچھ اشارات قرآن وسنت میں ملتے ہیں، جن سے مشورہ دینے والوں کی اہلیت وصلاحیت کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً اہلیت کی پہلی شرط یہ ہے کہ مشورہ دینے والا مخلص ہو۔ دوسری شرط علم ہے، علم سے مراد زیر غور مسئلے سے متعلق علم ہے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ مشورہ دینے والا اپنی بات دلیل کے ساتھ پیش کرے۔ (۲۰) ان تین شرائط کے علاوہ اگر کسی خطے اور علاقے کے لوگ کسی ایسی شرط کا اضافہ کرنا چاہیں جو اسلامی تعلیمات سے متصادم نہ ہوں تو ان کا اضافہ بھی باہمی مشورے سے کیا جاسکتا ہے۔

عہد رسالت میں اسلام میں سابقین اولین، اہل بدر اور وہ حضرات شوریٰ کے اہل سمجھے جاتے تھے، جن کی دین وملت کے لیے خدمات اور قربانیاں زیادہ ہوتی تھیں۔ امام بخاریؒ نے وضاحت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدین کن لوگوں سے مشورہ کیا کرتے تھے:

> وكانت الائمة بعد النبي ﷺ يستشيرون الامناء من اهل العلم في الامور المباحة ليأخذوا بأسهلها، فاذا وضح الكتاب والسنة لم يتعدوه الى غيره اقتداءً بالنبي ﷺ (۲۱)

رسول اللہ ﷺ کے بعد خلفا امانت دار اہل علم سے مباح امور میں مشورہ کیا کرتے تھے،

پھر مشورے کے بعد ایسی رائے کو قبول کرلیا کرتے تھے، جس پر عمل کرنا آسان ہوتا۔ البتہ جب کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کا حکم ان پر واضح ہو جاتا تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرتے ہوئے اس سے تجاوز کر کے کسی رائے کو کوئی وزن نہیں دیتے تھے۔

امام بخاریؒ کی اس روایت سے اہل مشورہ کے لیے دو شرائط نمایاں ہوتی ہیں، ایک ان کا امین ہونا، دوسرے صاحب علم ہونا۔ امانت داری کی شرط کے بارے میں اس حدیث سے بھی اشارہ ملتا ہے، جس میں آپ نے فرمایا:

المستشار مؤتمن (۲۲)

جس سے مشورہ کیا جائے، اس کی حیثیت صاحب امانت کی ہے۔

حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں بھی اہل علم ہی شوریٰ کے رکن ہوتے تھے۔ امام بخاریؒ لکھتے ہیں:

وکان القراء اصحاب مشورۃ عمرؓ کھولا کانوا او شبانا (۲۳)

قرا (اہل علم) حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ کے ارکان ہوتے تھے، خواہ وہ عمر رسیدہ ہوں یا نوجوان ہوں۔

ان روایات کی بنیاد پر بہت سے اہل علم اور فقہا نے مختلف آرا کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ ارکانِ شوریٰ میں عدالت کی صفت پائی جاتی ہو اور وہ اجتہادی بصیرت رکھتے ہوں۔ ابن عابدین کی رائے میں ارکان شوریٰ امتِ مسلمہ کے اعیان و اشراف ہو سکتے ہیں۔ ابن ہمام کی رائے میں علما، اہل رائے اور صاحب تدبیر لوگ مشورے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ (۲۴)

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں شوریٰ کی حیثیت ایک ایسے اصول کی رہی ہے، جسے امتِ مسلمہ کے اجتماعی امور میں کسی صورت نظر انداز نہیں کیا گیا۔ آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرامؓ کا بھی اس اصول پر اتفاق رہا ہے۔ شوریٰ کی حجیت قرآن کی نصوص سے بھی ثابت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل اور سنت سے بھی ثابت ہے اور صحابہ کرامؓ کے اتفاق نے بھی اس اصول کو تقویت بخشی ہے۔ لہٰذا شوریٰ کو نظر انداز کر کے امت کے اجتماعی امور میں کسی فرد واحد کا فیصلہ شریعت کے تین اہم مآخذ، قرآن، سنہ اور اجماع کی خلاف ورزی تصور کیا جائے گا۔

اصول تیسیر اور اسوۂ حسنہ

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں مشاورت کی طرح تیسیر کا اصول بھی واضح طور پر

نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ اصول درحقیقت آپ ﷺ کے رحمۃ للعالمین کے مقام پر فائز ہونے کی دلیل ہے، اور رحمۃ للعالمین ہونا آپ ﷺ کے خُلق عظیم کا مظہر ہے۔ لہٰذا اصول تیسیر یا اسلام کے قانونِ مصلحت کی روح کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کا گہرا تعلق مکارم اخلاق سے ہے، جو دین کا ایک بنیادی ستون ہے۔ حسن خلق ایک ایسی روح ہے کہ اس کے بغیر نہ ایمان کی تکمیل ہوتی ہے، نہ عبادات میں جان پیدا ہوتی ہے، اور نہ ہی ان کے بغیر زندگی کے کسی بھی شعبے میں معاملات، خواہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، درست ہو سکتے ہیں، لہٰذا اصول تیسیر کو ہم اعلیٰ اخلاق کے دائرے میں ہی صحیح طرح سمجھ سکتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو بعثت سے قبل بھی انسانیت کو اعلیٰ اخلاقی قدروں کا درس اپنی عملی زندگی سے دیتے رہے۔ صدق و امانت کا صحیح مفہوم تو الصادق اور الامین ﷺ نے نبوت سے قبل اپنے عمل کے ذریعے متعارف کرایا اور اپنے اعلیٰ اخلاقی اوصاف کے بل بوتے پر مجلس حلف الفضول کے رکن بنے۔

(۲۵) ذہنی و جسمانی اذیتیں برداشت کر کے بھی اپنے اوپر ظلم کرنے والوں کو دعائیں دیتے رہے:

اللّٰھم اھد قومی فانھم لا یعلمون (۲۶)

غلاموں کی آزادی کے مسئلے کو جس دینی جذبے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھایا، وہ نہ صرف خلق عظیم کا مظہر ہے، بل کہ اہل بصیرت کے لیے اس میں تیسیر کا اصول بھی کارفرما ہے۔ مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی جانب سے یہ کوششیں کی گئیں کہ یہاں مختلف مذاہب کے پیروکار مل جل کر امن و سکون کے ساتھ رہیں اور اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے باقاعدہ ایک تحریر کے ذریعے مختلف مذاہب کے لوگوں کو عمل پیرا ہونے کی دعوت بھی دی گئی۔ دستور مدینہ کے مطابق، مدینہ منورہ میں مسلمان، یہود اور وہاں آباد دیگر قبائل نے مل جل کر امن و سلامتی کے ساتھ رہنے پر اتفاق کیا اور اس دستور کو قبول کیا۔ (۲۷)

انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرا کے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ اور توحید الٰہ کا درس خلق عظیم کا سب سے بڑا سبق تھا۔ انسانی حریت اور حقوق انسانی کا تحفظ اس کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی سبق ہمارے اندر مساوات انسانی اور وحدت انسانیت کے شعور کو اجاگر کرتا ہے۔ مملکت کے نظم و نسق کو چلانے اور احکام کے نفاذ کے لیے نیابت و امانت کا نظریہ اسلام کے فلسفۂ اخلاق ہی کا شعبہ ہے۔

سود کا خاتمہ، جوئے پر پابندی اور ظلم کی ہر صورت کو ممنوع قرار دے کر عادلانہ معیشت کی راہ ہموار کرنے کی۔ غور کیجیے یہ تمام صورتیں، اسلام کے اخلاقی نظام کے دائرے میں بھی آتی ہیں اور ان سب میں انسانیت کے لیے تیسیر کے آثار گہرے نظر آتے ہیں۔

دشمن کے ساتھ جب جنگ کی نوبت آجائے اور گھمسان کا رن پڑنے لگے تو ایسے نازک موقع پر بھی حکم یہ دیا گیا کہ دشمن کے سپاہیوں کا مثلہ کرنا (اعضا کو کاٹنا، چہرے کو مسخ کرنا) جائز نہیں۔ اسی طرح خواتین، بچوں، بوڑھوں، عبادت گاہوں میں مصروف راہبوں، بیماروں اور معذوروں کو قتل کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا ہر ہر پہلو خلق عظیم کا نمونہ ہے۔ اس لیے جس پہلو کا بھی مطالعہ کیجیے، یسر کا اصول واضح طور پر نظر آتا ہے۔ آپ ﷺ کی نرم مزاجی، جذبۂ ہم دردی، خیر خواہی اور رحم دلی کا تقاضا ہے کہ آپ لوگوں کے لیے سہولت کا خیال رکھیں۔ ان کے لیے آسانیاں پیدا فرمائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا بہ غور عمیق مطالعہ کیا جائے تو آپ کے بہت سے فیصلوں میں مکارم اخلاق اور یسر کا لطیف امتزاج نظر آتا ہے۔ مثلاً ابوالحکم (ابوجہل) کے صاحب زادے حضرت عکرمہ بھی آخر وقت تک اسلام کی مخالفت کرتے رہے۔ فتح مکہ کے وقت بھی صفوان ابن امیہ اور سہیل بن عمرو کے ساتھ مل کر مزاحمت کی۔ عکرمہ ان لوگوں میں سے تھے، جن کے قتل کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جاری کر دیا گیا تھا، یہ فرار ہو کر یمن چلے گئے۔ ان کی زوجہ ام حکیم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ ﷺ سے اپنے شوہر عکرمہ کے لیے امن کی درخواست کی، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ام حکیم کی درخواست منظور کر لی اور عکرمہ کو اس کی ساری مزاحمتوں اور مخالفتوں کے باوجود امان دے دی۔ ام حکیم امان لے کر اپنے شوہر کو لینے یمن چلی گئیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاعات ملیں کہ ام حکیم عکرمہ کو لے کر واپس آ رہی ہیں اور عکرمہ اسلام قبول کرنے کے لیے آ رہے ہیں تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو مسجد میں جمع کیا اور فرمایا:

> یأتیکم عکرمة مومنا، فلا تسبوا اباہ، فان سبت المیت یؤذی الحیی (۲۸)
>
> دیکھو! عکرمہ ایمان قبول کرنے کے ارادے سے آ رہے ہیں، اب کوئی شخص اس کے والد کو برا بھلا نہ کہے، اس لیے کہ جو شخص مر چکا ہے، اس کو برا بھلا کہنے سے کسی زندہ انسان کو تکلیف ہوگی۔

حضرت عکرمہؓ کے قبول اسلام کے واقعے میں غور کیجیے۔ یہاں ایک طرف تو اسلام کے مکارم اخلاق کا نمونہ نظر آئے گا، کہ ام حکیم کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم کا اعتراف کرنا پڑا۔ دوسری طرف یسر کا پہلو ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عکرمہ کے لیے ماحول کو بہتر اور خوش گوار بنا دیا۔ لوگوں کو بھی ذہنی طور پر تیار کر دیا کہ وہ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ کو قبول کر لیں اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ

کریں۔ یہ بھی تیسیر کی ایک صورت ہے کہ ایسے فرد کے لیے پرامن اور خوش گوار ماحول پیدا کر دیا جائے، جس کے بارے میں اندیشہ تھا کہ لوگ اس کی اور اس کے والدین کی مزاحمت ومخالفت کی وجہ سے دل سے قبول کرنے میں جھجک محسوس کریں گے۔

عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین مشہور ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ قریش مکہ سے اس کے خفیہ رابطے تھے، مدینہ منورہ میں آباد یہودیوں کے ساتھ مل کر اس نے سازشیں کیں، انصار ومہاجرین کے درمیان تعصب پیدا کرنے اور تفریق پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ عبداللہ بن ابی ہی تھا، جس نے غزوۂ بنومصطلق سے واپسی پر کہا:

لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ (۲۹)

عزت والا ذلت والے کو سرزمین یثرب سے نکال باہر کرے گا۔

یہ الفاظ رئیس المنافقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے بارے میں کہے، اپنے لیے اس نے اعز (عزت والے) کا لفظ استعمال کیا۔ ابن ابی کے صاحب زادے جو مخلص مسلمان تھے، انہوں نے یہ الفاظ سنے تو اپنے باپ کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہیں دیں گے، اس وقت تک تمہیں مدینے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں، عاصم بن عمر کی روایت کے مطابق عبداللہ بن عبداللہ بن ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے باپ کو قتل کرنے کی اجازت بھی مانگی۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے بیٹے کو باپ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا اور فرمایا کہ جب تک وہ ہمارے ساتھ ہے، ہم اس کے ساتھ نرم دلی اور احسان کا سلوک کرتے رہیں گے۔ (۳۰)

عبداللہ بن ابی کا انتقال ہوا تو اس کے صاحب زادے حضرت عبداللہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ سے درخواست کی کہ آپ اپنی قمیص عطا فرما دیں، تاکہ اس کو ابن ابی کا کفن بنا دیا جائے اور پھر آپ ﷺ اس کی نماز جنازہ بھی پڑھا دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قمیص کفن کے لیے دے دی اور نماز جنازہ پڑھانے کے لیے بھی تیار ہو گئے، اور حضرت عمرؓ کی سخت مخالفت کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ (۳۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے نفاق اور اسلام دشمنی کا اچھی طرح علم تھا، لیکن اس سب کچھ کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ غالباً اس لیے پڑھا دی کہ آپ ﷺ کے بعد کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ اس کے بیٹے حضرت عبداللہؓ کو طعنہ دیں یا ان پر طنز کریں کہ ان کے والد اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے دشمن تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے ایک صحابی کو عار اور طعن سے بچانے کے لیے اس کی

نماز جنازہ پڑھائی۔ واللہ أعلم۔

یہاں بھی غور کیجیے تو آپ کو اخلاق کریمہ اور اصول تیسیر کا لطیف امتزاج نظر آئے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ایک صحابی کو طعن وتشنیع سے بچانے کے لیے یہ عمل کر گزرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب کچھ ایک مومن کی دل جوئی اور ان کے لیے بہتر ماحول پیدا کرنے کے لیے کیا۔

فتح مکہ مسلمانوں کے لیے بہت بڑی کامیابی تھی۔ جس شہر کے لوگوں نے تیرہ برس تک ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے تھے، جنہوں نے آپ ﷺ کے خاندان کا معاشرتی بائیکاٹ کر کے شعب ابی طالب میں طویل عرصے تک محصور رکھا، آج اسی شہر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کامیاب وکامران داخل ہو رہے ہیں، لیکن فاتحانہ فخر وغرور کے کوئی آثار نہیں، رسول اللہ ﷺ إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ○ (۳۲) تلاوت کرتے ہوئے مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے ہیں اور اپنا خیمہ شعب ابی طالب ہی میں لگواتے ہیں۔ فتح مبین کے جملہ آثار مکمل ہونے پر آپ ﷺ کی جانب سے امن وسلامتی کا اعلان کیا جاتا ہے:

جو شخص بیت اللہ میں داخل ہو جائے اسے امن ہے۔

جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کرے اسے امن ہے۔

جو شخص ہتھیار رکھ دے اسے بھی امن ہے۔

جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اسے بھی امن ہے۔

ابوسفیان کے سامنے یہ اعلان بھی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ہوا:

اليوم يوم المرحمة، يعز الله فيه قريشا (۳۳)

آج کا دن رحم وکرم کا دن ہے۔ آج کے دن اللہ تعالیٰ قریش کو عزت بخشے گا۔

قریش نے مسلمانوں کے خلاف جو مظالم ڈھائے تھے، ان کی وجہ سے انہیں اندیشہ تھا کہ اب ان مسلمانوں کو مکمل کامیابی کے بعد مکے والوں کے خلاف سخت انتقامی کارروائی ہوگی، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے جس بڑے پیمانے پر عفو ودرگزر اور معافی کا مظاہرہ کیا گیا، اس سے نہ صرف یہ کہ اہل ایمان کی اخلاقی بالادستی قائم ہوئی، بل کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ کے لیے پرامن وپرسکون رہائش کا ماحول بھی مہیا کر دیا۔ تیسیر کا اصول صرف قانونی ضابطوں میں سہولت وتخفیف مہیا کرنے تک محدود نہیں تھا، بل کہ ہر شعبۂ زندگی میں اس اصول کی تطبیق ہوتی رہی ہے۔

قرآن حکیم میں انسان کے بارے میں کہا گیا ہے:

وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا ○ (۳۴)

انسان تو کم زور پیدا کیا گیا ہے۔

خالق کائنات انسان کی فطرت سے خوب واقف ہے، وہ اس کی فطری کم زوریوں کو اچھی طرح جانتا ہے، انسانی کم زوریوں کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے زندگی کے معاملات، احکام اور عبادات میں اس کے ضعف کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی سہولت کا کس قدر خیال تھا؟ اس کا اندازہ معراج کے موقع پر نمازوں کی فرضیت کے واقعے سے ہوسکتا ہے۔ پچاس سے پانچ نمازوں تک کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار اللہ تعالیٰ کے حضور درخواست کرنا پڑی۔ (۳۵)

تیسیر کے دو پہلو ہیں:

ایک دفع الضرر، یعنی مشکلات، دشواریوں اور سختیوں کو دور کرنا۔

اور دوسرا پہلو ہے جلب المصلحہ، یعنی انسانی مصلحتوں کا خیال رکھنا۔ سہولت اور آسانی فراہم کرنا۔

پہلا یعنی دفع الضرر مقدم ہے۔ پہلے مشکلات اور دشواریوں کو ختم کیا جاتا ہے اور پھر سہولتوں اور مصلحتوں کے حصول کو ممکن بنایا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل اور آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی امور میں سہولت پیدا کرنا اور مشقت کو دور کرنا مقدم اور ضروری ہے۔ عبادات جیسے امور میں بھی تخفیف اور سہولت پیدا کرنے کا حکم ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

اذا أم احدكم الناس فليخفف فان فيهم الصغير والكبير، الضعيف والمريض فاذا صلى وحده فليصل كيف شاء (۳۶)

تم میں جب کوئی شخص امامت کے فرائض انجام دے تو اسے چاہیے کہ وہ نماز میں تخفیف کرے (طویل نہ کرے) تنہا نماز پڑھے تو پھر اختیار ہے، جیسے چاہے پڑھے۔

صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

فايكم أم الناس فليوجز، فان من ورائه الكبير والضعيف و ذاالحاجة (۳۷)

تم میں جو شخص امام بنایا جائے، وہ نماز کو مختصر رکھے، اس لیے کہ اس کے پیچھے بوڑھے، کم زور اور حاجت مند سب ہی موجود ہوتے ہیں (لہٰذا ان کا خیال رکھنا واجب ہے)۔

ایک مرتبہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے نماز پڑھائی، اور اپنے ذوق کے مطابق نماز طویل کر دی تو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت تنبیہ فرمائی:

یامعاذ! أفتان انت؟ أفتان انت؟ افتان انت؟

اے معاذ! کیا تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالنا چاہتے ہو؟ یہ الفاظ آپ ﷺ نے تین مرتبہ فرمائے۔(۳۸)

اس حدیث سے اندازہ کر لیجیے کہ آپ ﷺ کو لوگوں کی سہولت کا کس قدر خیال تھا۔ نماز جو افضل العبادات ہے اور جو کفر و اسلام کے درمیان فرق کرنے والی عبادت ہے، اس میں بھی تخفیف و سہولت کا کس قدر خیال رکھا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام الفتح میں مکہ مکرمہ کے لیے رمضان المبارک میں روانہ ہوئے۔ صحابہ کرامؓ ساتھ تھے، رمضان المبارک میں روزہ رکھنا فرض ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے مسافر کو یہ سہولت دی ہے کہ وہ اگر سفر میں دقت محسوس کرے تو حالت سفر میں روزہ چھوڑ سکتا ہے، بعد میں قضا کر لے۔ اس سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھنے کو ترجیح دی، آپ ﷺ نے روزہ رکھا تو بہت سے صحابہ کرامؓ نے بھی روزہ رکھ لیا، لیکن بعض صحابہ کرامؓ سفر اور روزے کی وجہ سے نڈھال ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کیا گیا کہ:

ان الناس قدشق علیھم الصیام، وانما ینظرون فیما فعلت

لوگ روزہ کی وجہ سے مشقت میں پڑ گئے ہیں اور ان کی نظریں رسول اللہ ﷺ پر ہیں کہ آپ کا عمل کیا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ لوگوں کو روزہ نڈھال کر رہا ہے تو آپ ﷺ نے نماز عصر کے بعد پانی منگوایا اور اسی وقت روزہ کھول دیا۔ آپ ﷺ کو دیکھ کر صحابہ کرامؓ نے بھی روزہ کھول دیا۔(۳۹)

اس روایت پر غور کیجیے۔ نمازِ عصر کے وقت تک تو لوگوں نے برداشت کر لیا، بعد کا وقت پورا کرنا مشکل ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوت و استطاعت کی وجہ سے روزہ مکمل کر سکتے تھے، وقت بھی زیادہ باقی نہیں تھا، لیکن لوگوں کی سہولت کی خاطر آپ نے خود دوارہ کھول کر لوگوں کو دعوت دی کہ وہ بھی رمضان المبارک کا روزہ کھول دیں۔ آپ ﷺ نے اپنے عمل سے اس کا جواز بتا دیا کہ حالت سفر میں روزہ کھول دینا جائز ہے۔ اور اگر روزہ رکھنے کی وجہ سے کسی کو اندیشہ ہو کہ وہ سخت مشکل کا شکار ہو سکتا ہے کہ تو اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے۔ ایک مرتبہ ایک سفر میں آپ ﷺ نے دیکھا کہ ایک شخص کی

حالت خراب ہے، لوگ اس کے گرد جمع ہیں اور سایہ کیے ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ آپ کو بتایا گیا کہ یہ شخص روزے سے ہے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ليس البران تصوموا في السفر (۴۰)

سفر میں روزہ رکھنا تو نیکی نہیں ہے۔

صحیح مسلم ہی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

عليكم برخصة الله الذى رخص لكم (۴۱)

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی رخصت سے فائدہ اٹھاؤ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں بہت سی رخصتیں اور سہولتیں ملتی ہیں، سب کو الگ الگ ذکر کرنا مشکل ہے۔ مثلاً سفر کی حالت میں قصر نماز کی سہولت، جمع بین الصلاتین کی سہولت، بیماری یا تکلیف کی صورت میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کی سہولت، بیٹھ کر بھی نہ پڑھ سکے تو لیٹ کر، ارشاروں سے پڑھنے کی سہولت حاصل ہوتی ہے۔ وضو اور غسل کے لیے پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو تو تیمم کی سہولت دی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عمال کو انتظامی اور عدالتی ذمے داریاں دے کر جب دیگر علاقوں میں روانہ فرماتے تو انہیں خاص طور پر ہدایات دیتے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن روانہ فرمایا تو انہیں ہدایات دیتے ہوئے فرمایا:

يسرا ولا تعسرا، بشرا ولا تنفرا (۴۲)

تم دونوں لوگوں کو سہولت مہیا کرنا، انہیں مشقت میں نہ ڈالنا، خوش خبری سنانا، متنفر نہ کرنا۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی اپنے کسی صحابی کو کوئی ذمے داری سپرد فرماتے تو فرماتے:

بشروا ولا تنفروا، ويسروا ولا تعسروا (۴۳)

لوگوں کو امید و خوشی کی باتیں بتاؤ، انہیں متنفر نہ کرو، انہیں آسانیاں فراہم کرو، دشواریاں پیدا نہ کرو۔

اس اصول کی اہمیت کا اندازہ اس روایت سے کیا جا سکتا ہے، جسے امام بخاریؒ نے کتاب الایمان میں نقل کیا ہے:

ان الدين يسر، ومن يشاد الدين الاغلبه، فسددوا، وقاربوا وأبشروا

واستعینوا بالغدوۃ والروحۃ وشئی من الدلجۃ (۴۴)

یقیناً دین آسان ہے، جو شخص دین میں شدت اختیار کرے گا تو دین اس کو مغلوب کر دے گا، لہٰذا اعتدال کی راہ اختیار کرو، میانہ روی سے قریب رہو، ثواب کی امید رکھو، خوشیاں بانٹو، اور صبح وشام اور رات کے کچھ حصے میں نمازوں سے تقویت حاصل کرو۔

دین میں اصول تیسیر کی اہمیت کا اندازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ سے بھی لگایا جاسکتا ہے، جن میں آپ ﷺ نے صراحت کے ساتھ فرمایا:

احب الدین الی اللّٰہ الحنیفیۃ السمحہ اور ولکنی بعثت بالحنیفیۃ السمحہ(۴۵)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین دین وہ دین حنفی ہے جو آسان ہے۔ اور میں تو آسان دین حنفی دے کر بھیجا گیا ہوں۔

معاملات میں بھی تیسیر کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً بچوں کے نکاح میں ولی کا تقرر اس لیے کیا گیا ہے کہ لڑکیوں کے نکاح جیسے اہم معاملے میں بھرپور مدد کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ نکاح کا فیصلہ زندگی کا ایک اہم فیصلہ ہے۔ شریعت نہیں چاہتی کہ ایسے اہم فیصلوں میں سولہ سال یا بیس اکیس سالہ بچیوں کو تنہا چھوڑ دیا جائے، انہیں بڑوں کی اعانت کی ضرورت ہے۔ بزرگ اپنے تجربے اور معاملہ فہمی سے ان کی بہت مدد کر سکتے ہیں۔ لہٰذا انہیں پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ ازدواج کے معاملے میں ان کی مدد کریں۔ دوسری طرف لڑکیوں کو بھی حق دیا گیا ہے کہ وہ بھی اپنی رائے کا اظہار کریں اور یہ کہ بزرگ اور والدین ان کی رائے کا بھی خیال رکھیں۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ثیبہ (جو نکاح کا تجربہ کر چکی ہے) کا نکاح کرانے سے پہلے اس کی رائے معلوم کر لی جائے، اور کنواری بچی کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے۔ (۴۶) حضرت خنسا بنت حزام کا واقعہ مشہور ہے، ان کے والد نے ان کا نکاح کرا دیا تھا لیکن حضرت خنسا کو یہ شخص پسند نہ تھا، انہوں نے یہ معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تو آپ ﷺ نے اس نکاح کو ختم کر دیا۔ (۴۷) مقصد یہ تھا کہ کسی بھی فرد کو کسی عمل کی وجہ سے مشقت اور تکلیف نہ پہنچے، جہاں کہیں تکلیف وضرر کی صورت پیدا ہوتی ہے شریعت کا اصول تیسیر متحرک ہوتا ہے اور ضرر وتکلیف کو دور کر کے آسانی اور سہولت مہیا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں خیار بلوغ، خیار عیب وغیرہ کی بحث بھی کتب فقہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ (۴۸)

ادائیگی زکوٰۃ میں شریعت نے یہ سہولت دی ہے کہ وہ تمام اموال جو انسان کی بنیادی ضروریات کو

پورا کرتے ہیں، انہیں زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ فقہا نے حوائج اصلیہ (انسان کی بنیادی ضروریات) میں رہائش، غذا، لباس، گھریلو ضروری سامان، سواری، ملازم وغیرہ کو شامل کیا ہے۔ اسی طرح لین دین اور بیع وشرا میں خیار شرط، خیار رؤیت، خیار عیب بڑی سہولت مہیا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ شریعت نے خرید وفروخت کی ہر اس صورت کو ممنوع قرار دیا ہے، جس میں غرر (دھوکا) پایا جاتا ہو:

عن ابی ھریرۃؓ: ان النبی ﷺ نھی عن بیع الغرر

رسول اللہ ﷺ نے بیع غرر سے منع فرمایا ہے۔ (۴۹)

شبہ کا فائدہ ملزم کے حق میں جاتا ہے، حتی کہ حدود جیسی سزائیں بھی شبہات کی صورت میں ختم ہو جاتی ہیں۔ جرم وسزا کے بارے میں شریعت کا یہ اصول بہت اہم ہے کہ معاف کرنے میں غلطی کر جانا بہتر ہے اس بات سے کہ جج/ قاضی سزا دینے میں غلطی کر جائے۔

اصولِ تیسیر کا ایک اور زاویے سے بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں غلو اور شدت پسندی سے منع فرمایا ہے:

ایاکم و الغلو فی الدین، فانما أھلك من کان قبلکم الغلو فی الدین (۵۰)

دین میں مبالغہ آرائی سے بچو، اس لیے کہ تم سے پہلے قومیں دین میں غلو کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔

شدت پسندی اور غلو کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی منقول ہے:

لا تشدّوا علی انفسکم فیشدد علیکم، فان قوما شددوا علی انفسھم فشدد اللّٰہ علیھم فتلك بقایا ھم فی الصوامع والدیار رھبانیۃ ابتدعوھا ما کتبناھا علیھم (۵۱)

اپنے آپ پر سختی نہ کرو، ورنہ تم مشقت میں ڈال دیے جاؤ گے، اس لیے کہ جو قوم اپنے لیے شدت کا راستہ اختیار کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس پر سختی کو مسلط کر دیتا ہے۔ آج بھی اس طرح شدت اختیار کرنے والے عبادت گاہوں اور بستیوں میں پائے جاتے ہیں، انہوں نے رہبانیت کا وہ راستہ اختیار کر لیا ہے، جو ہم نے ان کے لیے ضروری قرار نہیں دیا۔

شدت، انتہا پسندی اور غلو اسلام کے نظم اعتدال وتوازن کے خلاف ہیں، اس لیے اسلام کے فلسفہ اخلاق میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ شدت پسندی اور غلو پر مبنی کوئی نظم بھی نہ ہمہ گیر ہوتا ہے، نہ اس میں جامعیت ہوتی ہے، بل کہ ایسا نظام اپنے پیروکاروں کو تباہی اور ہلاکت کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ اس بات

کی طرف اشارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں ملتا ہے:

هلك المتنطعون (۵۲)

موشگافیاں اور غلو کرنے والے ہلاک ہوئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ تین مرتبہ فرمائے۔ ہلاکت اور تباہی کی طرف جانے والا ہر راستہ بند کرنے کی ضرورت ہے، رسول اللہ ﷺ نے صاف الفاظ میں متنبہ کر دیا کہ شدت پسندی اور غلو کا راستہ تباہی کی طرف جاتا ہے۔

غلو اور انتہا پسندی کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں توسط، اعتدال اور احسان کی تعلیم دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ساری زندگی یہ کوشش رہی کہ انسان کو فطرت سے نہ ہٹنے دیا جائے، اللہ تعالیٰ تو ہر انسان کو فطرت پر ہی پیدا کرتا ہے۔ پھر انسانوں کا اپنا پیدا کردہ ماحول، بگڑے ہوئے رسم و رواج اور خواہشاتِ نفس پر مبنی اعمال و افعال اسے فطرت سے دور کر دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے شر و فساد سے روکنے اور انسان کو فطرت کے عطا کردہ اعتدال و توازن کے راستے پر گامزن رکھنے کے لیے تعلیم و تربیت کا ایسا مضبوط نظام قائم فرما دیا ہے کہ اگر انسان اس پر عمل پیرا رہے تو فطرت کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزار سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریباً چودہ پندرہ سالہ علمی، فکری اور اخلاقی تربیت کے نتیجے میں جب ایک ایسی جماعت تیار ہو گئی، جس میں ہر طرح کا توازن اور اعتدال تھا اور وہ ہر لحاظ سے اس قابل تھی کہ خلافت و امامت کے فرائض انجام دے سکے تو سن دو ہجری میں تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا، اسی موقع پر یہ آیت مبارکہ بھی نازل ہوئی:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۵۳)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک معتدل امت بنایا ہے، تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو، اور رسول تم پر گواہ بنے۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف جماعتِ صحابہ کرامؓ کے راہ اعتدال پر ثابت قدم ہونے کی گواہی دی ہے، بل کہ اس امت پر یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ یہ امت جب تک اپنے اندر امتِ وسط کے اوصاف اپنائے رکھے گی، اس وقت تک وہ عالمی امور میں اپنا موثر کردار بھی ادا کرتی رہے گی۔

توسط اور اعتدال انسان میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اسے اپنے خالق و مالک کی معرفت حاصل

ہو جائے، اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبے سے سرشار ہو کر اعمال صالحہ اور اخلاقِ فاضلہ کا نمونہ پیش کرنے لگے۔

سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ نے چھ امور کو ذکر کیا ہے، جو رسول اللہ ﷺ اپنی امت کی رہ نمائی کے لیے انجام دیتے رہے ہیں۔ ان چھ امور کی تکمیل سے امت اس قابل ہو جاتی ہے کہ وہ پورے عزم و اعتماد کے ساتھ اپنے فرائض منصبی انجام دے سکے۔

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۵۴)

۱۔ رسول انہیں معروف کا حکم دیتے ہیں۔ ۲۔ منکر سے روکتے ہیں۔ ۳۔ پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں۔ ۴۔ خبائث کو حرام قرار دیتے ہیں۔ ۵۔ اور انہیں بوجھ سے نجات دلاتے ہیں۔ ۶۔ گردنوں میں پڑے طوق دور کرتے ہیں۔

ان چھ امور میں غور کیجیے، ان میں خلق عظیم اور یسر کے پہلو نمایاں نظر آئیں گے۔

معروف میں وہ تمام اچھائیاں داخل ہیں، جنہیں شریعت تسلیم کرتی ہے، جنہیں فطرت سلیمہ تسلیم کرتی ہے اور جنہیں عقل سلیم بھی مانتی ہے اور جنہیں تمام انبیا علیہم السلام کی شریعتوں نے اخلاقی اقدار میں شمار کیا ہے۔ منکر معروف کی ضد ہے۔ طیبات میں تمام پاکیزہ، حلال اور انسانی صحت و معاشرے کے لیے مفید اشیا شامل ہیں۔ خبائث کے مفہوم میں تمام مضر اشیا، آلودہ اور حرام چیزیں داخل ہیں۔ اصر اور اغلال میں وہ تمام احکام اور اعمال شامل ہیں، جو انسان کے لیے مشقت اور دشواری کا سبب بنتے ہیں۔ ہر قسم کی توہم پرستی، ناقابل عمل پابندیاں اور غلط و گم راہ قسم کے عقائد بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے رسول اس قسم کی تمام مشکلات سے نجات دلاتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں تیسیر کا اصول دراصل قرآن حکیم کی تعلیمات کا عکس ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسان کو بلا وجہ مشقت اور تکلیف میں ڈالنا نہیں چاہتے، بل کہ آسانی اور سہولت مہیا فرماتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (۵۵)

اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، اور وہ تمہارے لیے سختی نہیں چاہتا۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (۵۶)

دین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے کوئی تنگی نہیں رکھی۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (۵۷)

اللہ کسی کو اس کی گنجائش سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ خلق عظیم کا نمونہ بن کر انسانیت کو اس دنیا کی الجھنوں اور پریشانیوں سے بھی بچاتے ہیں اور آخرت کی دائمی زندگی میں بھی مشکلات اور دشواریوں سے نجات دلاتے ہیں۔اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا:

بعثت بالحنیفیة السمحه

اللہ تعالیٰ نے مجھے معتدل اور آسان دین حنیف دے کر بھیجا ہے۔

یسر کا یہی انداز تھا جسے خلفائے راشدین نے اپنایا، محدثین خلفائے راشدین کے طرز عمل کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین کا طریق کار یہ رہا ہے کہ وہ مباح امور میں امانت دار اہل علم سے مشورہ کیا کرتے تھے، اور مشاورت کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ رائے اختیار کی جائے، جس میں لوگوں کے لیے سہولت اور آسانی ہو۔(۵۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرتے ہوئے ہمارے تمام فقہا، متقدمین ہوں یا متاخرین، یا دور جدید کے معاصرین، سب ہی اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں۔قانون سازی کا مسئلہ ہو یا کوئی انتظامی معاملہ، تمام امور میں تیسیر کے اصول کو مدنظر رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ فقہائے احناف نے استحسان کے اصول کو اس کے لیے استعمال کیا، اس لیے کہ استحسان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔امام سرخسی نے استحسان کی تعریف یہ کی ہے:

ظاہری قیاس کو ترک کر کے اس پہلو کو اختیار کرنا جو عام لوگوں کے لیے مفید ہو۔(۵۹)

اس میں تمام انسانی مصلحتیں شامل ہیں، ان کا تعلق خواہ دنیوی مصلحتوں سے ہو یا اخروی مصلحتوں سے ہو۔اسی لیے شاطبی اور عزالدین جیسے فقہا کہتے ہیں:

الشریعة کلها مصالح،

شریعت تو ساری کی ساری انسانی مصلحتوں کے اعتبار کا نام ہے۔(۶۰)

مالکی فقہا نے استصلاح یا المصالح المرسلہ میں ساری مصلحتوں کو سمو دیا ہے۔حنبلی فقہا میں امام ابن قیمؒ نے بہت زور دار الفاظ میں وضاحت کے ساتھ اعتبار مصلحت پر بحث کی ہے۔شافعی فقہا نے استدلال کے لیے المصالح مرسلہ کو بہ طور دلیل قبول کیا ہے، بل کہ شافعی فقہا تو محض مصلحہ ملائمہ (۶۱) کو بہ طور دلیل قبول کرتے ہیں، معروف شافعی فقیہ امام غزالیؒ نے اصول فقہ پر اپنی کتاب المستصفی میں اس اصول پر بہ طور

دلیل بحث کی ہے۔(۶۲)

معاصر فقہا سب ہی اعتبار مصلحت کے اصول پر متفق نظر آتے ہیں، بل کہ معاصرین نے اس موضوع پر بہت وقیع کام کیا ہے۔اس موضوع پر مستقل اور مسلسل علمی بحثیں اور کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ اس طرح اسوۂ حسنہ کا یہ پہلو اب ایک تناور اور سایہ دار درخت بن چکا ہے، جس کے سائے سے اس دور کے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

حوالے

۱۔ القلم:۴

۲۔ ترمذی۔ جامع الترمذی: کتاب الجہاد، باب ماجاء فی المشورۃ۔ ابن تیمیہ۔ السیاسۃ الشرعیۃ۔ دارالارقم، کویت ۱۴۰۶ھ: الفصل السابع ،ص۲۱۳۔ الدلیس، محمد ضیاء الدین۔ النظریات السیاسیۃ الاسلامیہ۔ دار التراث، قاہرہ ۱۹۷۹:ص۳۲۳

۳۔ طبری۔ التفسیر الکبیر: ج۹ ص۶۶۔ الزمخشری، محمود بن عمر۔ الکشاف: ج۱، ص۲۲۶ تفسیر آل عمران آیت:۱۵۹

۴۔ طبرانی۔ الاوسط: ج۶ ص۳۶۵، رقم ۶۲۲۷

۵۔ ابوحیان۔ البحر المحیط: ج۷، ص۵۲۲۔ نیز دیکھیے: فاروقی، محمد یوسف، عہد رسالت میں معاشرے اور مملکت کی تشکیل۔ اظہار القرآن، لاہور ۲۰۱۲:ص۱۵۸

۶۔ مسلم۔ الجامع الصحیح، کتاب الایمان، باب ان الدین النصیحہ: رقم ۱۹۴

۷۔ دیکھیے: مسلم۔ الجامع الصحیح: کتاب الادب، باب الدین النصیحہ: رقم ۲۰۰

۸۔ ابن ہشام۔ السیرۃ النبویہ۔ مصطفیٰ البابی الحلبی، قاہرہ، ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء: ج۲، ص۲۷۲

۹۔ ابن قیم۔ زاد المعاد۔ دار الکتاب العربی، بیروت ۱۴۲۵ھ/ ۲۰۰۵ء: ص۵۲۰۔ محمد حمید اللہ۔ عہد نبوی کے میدانی جنگ۔ علمی مرکز، راولپنڈی، ۱۹۹۸ء: ص۱۱۴۔ ندوی، سید سلیمان۔ سیرۃ النبی۔ ادارہ اسلامیات، لاہور ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء: حصہ اول، ص۲۶۰

۱۰۔ ترمذی۔ جامع الترمذی: کتاب العلم، باب ما جاء فی فضل الفقہ علی العبادہ: رقم ۳۶۸۷۔ ابن ماجہ۔ سنن ابن ماجہ: کتاب الزہد، الحکمۃ: رقم ۴۱۶۹۔ حکمت کے اقوال و اعمال پر ہم یہاں بحث نہیں کریں گے، اس لیے کہ اس بحث کی یہاں گنجائش نہیں، اس موضوع پر الگ سے ایک مقالہ لکھنے کا ارادہ ہے۔

۱۱۔ بخاری۔ الجامع الصحیح: کتاب الاحکام، باب العرفاء للناس: رقم ۷۱۷۶۔ ابن ہشام۔ السیرۃ النبویہ: ج۴، ص ۱۳۱-۱۳۲۔ عہد رسالت میں مملکت اور معاشرے کی تشکیل: ص۲۰۲-۲۰۳

۱۲۔ عوامی نمائندگی کے موضوع پر ہمارا مقالہ ''عرافہ ونقابہ'' دیکھیے: عہد رسالت میں مملکت ومعاشرہ: ص۱۹۹، ۲۱۵

۱۳۔ ابن ماجہ۔ سنن ابن ماجہ: ابواب الاذان والسنۃ فیھا، باب بدء الاذان: ح نمبر ۷۰۷

۱۴۔ ابن ماجہ۔ حوالہ بالا۔ جامع الترمذی، کتاب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی بدء الاذان: رقم ۱۹۰۔ ابوداؤد۔ سنن ابی داؤد: کتاب الصلوٰۃ، باب بدء الاذان: رقم ۴۹۸۔ ابن کثیر۔ السیرۃ النبویہ۔ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ت۔ن: ج ۱، ۴۱۸

۱۵۔ الشوریٰ: ۳۷۔۳۸

۱۶۔ اصلاحی، امین احسن۔ تدبر قرآن: ج ۶، ص ۱۷۷۔ سورۃ الشوریٰ کی آیات ۳۷۔۳۸ کی تفسیر کا مطالعہ کیجیے تکبر، سرکشی، ظلم وغصے کا مزاج رکھنے والے انانیت کا شکار ہوتے ہیں اور صرف اپنی رائے پر اصرار کرتے ہیں، دوسروں کی رائے کو کوئی وزن نہیں دیتے۔ اس کے برعکس جن لوگوں میں تواضع اور انکساری ہوتی ہے، وہ اجتماعی معاملات میں باہمی مشورے سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں میں تعاون وخیر خواہی کا جذبہ ہوتا ہے۔

۱۷۔ آل عمران: ۱۵۹

۱۸۔ حضرت علیؓ سے جب فاذا عزمت فتوکل علی اللہ کی تفسیر پوچھی گئی تو انہوں نے فرمایا: مشورۃ اھل الرأی ثم اتباعھم یعنی اہل رائے سے مشورے کے نتیجے میں جو عزم ویقین پیدا ہو، اس پر عمل کرنا عزم ہے۔ دیکھیے: ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر: ج ۱، ص ۴۴۰: جصاص نے عزم کو اس طرح بیان کیا ہے کہ عزیمت کو مشورے کے بعد ذکر کیا گیا ہے، یہ اسلوب اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عزم مشورے کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے، دیکھیے: جصاص۔ احکام القرآن۔ تفسیر آل عمران: ۱۵۹: ج ۲، ص ۵۰

۱۹۔ دارمی، عبداللہ۔ سنن الدارمی۔ المکتبۃ العلمیہ، بیروت، ت ن: ج ۱، ص ۵۸

۲۰۔ خلافت راشدہ میں شوریٰ کے نظائر کے بارے میں دیکھیے: عہد رسالت میں معاشرہ اور مملکت کی تشکیل: ص ۱۶۵۔۱۷۴: Early Islamic Lego Polictical Institutions۔ شریعہ اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱: ص ۸۱۔۹۳

۲۱۔ بخاری۔ الجامع الصحیح: کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب قول اللہ تعالیٰ وامرھم شوریٰ بینھم

۲۲۔ ترمذی۔ جامع الترمذی: کتاب الادب، باب ماجاء ان المستشار مؤتمن: رقم ۲۸۲۲

۲۳۔ بخاری۔ الجامع الصحیح: کتاب الاعتصام، باب امرھم شوریٰ بینھم

۲۴۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: غازی، محمود احمد۔ Studies in the Political and Constitutional Thought of Islam۔ نیشنل بک ہاؤس، لاہور ۱۹۹۲: ص ۸۲۔۸۳

۲۵۔ ابن ہشام۔ السیرۃ النبویہ۔ مطبعہ مصطفیٰ البابی، قاہرہ ۱۹۳۶ء: ج ۱، ص ۱۴۱، ۱۴۲۔ عبداللہ بن جدعان کی رہائش گاہ پر حلف الفضول کا معاہدہ ہوا تھا، آپ ﷺ زمانہ اسلام میں بھی اس معاہدے کو اہمیت دیتے تھے، فرماتے تھے کہ اگر آج بھی کوئی مظلوم اس معاہدے کی رو سے مجھے بلائے گا تو میں اس کی مدد کے لیے آؤں گا۔

۲۶۔ خالد علوی۔ رسول رحمت، بہ حوالہ طبقات ابن سعد: ج ۱، ص ۲۱۰

۲۷۔ ابن ہشام۔ السیرۃ النبویہ: ج ۲، ص ۱۴۷۔ ابن کثیر۔ السیرۃ النبویہ، دار الکتب العلمیہ، بیروت ت۔ن: ج ۱، ص ۴۹۰، ۴۱۰

۲۸۔ محمد ادریس کاندھلوی۔ سیرۃ المصطفیٰ۔ مکتبہ عثمانیہ، لاہور ۱۹۹۲ء: ج ۲، ص ۱۳۹، صفوان بن امیہ کے لیے عمیر بن وہبؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی اور امان کی درخواست کی، جسے آپ ﷺ نے منظور فرمایا۔ حضرت عمیر بن وہب نے صفوان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ الفاظ کہے: **ھو افضل الناس، وابر الناس، واحلم الناس و خیر الناس**، ان الفاظ سے اندازہ کیجیے کہ آپ ﷺ کے بلند اخلاق اور وسعت قلبی کا لوگوں کو کس قدر یقین تھا: ابن ہشام۔ السیرۃ: ج ۴، ص ۶۰

۲۹۔ المنافقون: ۸

۳۰۔ ابن ہشام۔ السیرۃ النبویہ: ج ۳، ص ۳۰۵

۳۱۔ اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی، **لا تصل علی أحد منھم مات ابدا ولا تقم علی قبرہ.** دیکھیے: مسلم۔ الجامع الصحیح: کتاب صفات المنافقین واحکامھم، باب صفات المنافقین: رقم ۷۰۲۷

۳۲۔ الفتح: ۱

۳۳۔ محمد ادریس کاندھلوی۔ سیرۃ المصطفیٰ: ج ۲، ص ۱۱۶

۳۴۔ النساء: ۲۸

۳۵۔ دیکھیے ابن ہشام۔ السیرۃ النبویہ: ج ۲، ص ۴۹، ۵۰

۳۶۔ مسلم۔ الجامع الصحیح۔ کتاب الصلوٰۃ، باب امر الأئمۃ بتخفیف الصلوٰۃ: رقم ۱۰۴۶

۳۷۔ ایضاً: رقم ۱۰۴۴

۳۸۔ بخاری۔ الجامع الصحیح۔ کتاب الأذان، باب من شکی امامہ اذا طول: رقم ۷۰۵

۳۹۔ مسلم۔ الجامع الصحیح۔ کتاب الصیام، باب جواز الصوم والفطر فی رمضان للمسافر: رقم ۲۶۱۱

۴۰۔ ایضاً: رقم ۲۶۱۲

۴۱۔ ایضاً: رقم ۲۶۱۴

۴۲۔ مسلم۔ الجامع الصحیح۔ کتاب الجہاد والسیر، باب فی الأمر بالتیسیر: رقم ۴۵۲۶

۴۳۔ ایضاً: رقم ۴۵۲۵

۴۴۔ بخاری۔ الجامع الصحیح۔ کتاب الایمان، باب الدین یسر: رقم ۳۹

۴۵۔ بخاری۔ الجامع الصحیح۔ کتاب الایمان: ج ۵، ص ۲۶۶۔ ترمذی، جامع ترمذی۔ کتاب المناقب۔ حمد بن حنبل، المسند: ج ۶، ص ۱۱۶

۴۶۔ ابوداؤد۔ سنن ابی داؤد۔ کتاب النکاح، باب فی الاستعفار: رقم ۲۰۹۲

۴۷۔ ایضاً، باب فی الثیب: رقم ۲۱۰۱

۴۸۔ مثلاً اگر شوہر کسی موذی مرض میں مبتلا ہو جائے، یا ازدواجی حقوق ادا کرنے سے قاصر ہو جائے تو بیوی کو علیحدگی حاصل کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ دیکھیے: الکاسانی۔ بدائع الصنائع: کتاب النکاح، باب خلوالزوج من عیب الجب والعنۃ: ج ۲، ص ۶۳۴

۴۹۔ ابوداؤد۔ سنن ابی داؤد۔ کتاب البیوع، باب فی بیع الغرر: رقم ۳۳۷۶

۵۰۔ نسائی۔ سنن نسائی: کتاب مناسک الحج، باب التقاط الحصی: رقم ۳۰۵۹

۵۱۔ ابوداؤد: کتاب الادب، باب فی الحسد: رقم ۴۹۰۴

۵۲۔ مسلم۔ الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب ھلک المتطعون: رقم ۲۶۷۰

۵۳۔ البقرہ: ۱۴۳

۵۴۔ الاعراف: ۱۵۷

۵۵۔ البقرہ: ۱۸۵

۵۶۔ الحج: ۷۸

۵۷۔ البقرہ: ۲۸۶

۵۸۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: لیأخذوا بأ سھلھا۔ دیکھیے: بخاری: کتاب الاعتصام، باب قول اللہ تعالیٰ وامرھم شوریٰ بینھم

۵۹۔ السرخسی۔ اصول السرخسی۔ مکتبۃ المدینہ، لاہور ۱۹۸۱ء: ج ۲، ص ۱۹۹۔۲۰۸

۶۰۔ عزالدین، عبدالعزیز السلمی۔ قواعد الاحکام فی مصالح الأنام۔ دارالکتب العلمیہ، بیروت (ت۔ن): ج ۱، ص ۹

۶۱۔ وہ تمام مصلحتیں جو اس جنس کے تحت آتی ہوں، جن کا شارع نے بغیر کسی معین دلیل کے اعتبار کیا ہے۔ دیکھیے: وھبہ زحیلی۔ اصول الفقہ الاسلامی۔ دارالفکر المعاصر، بیروت ۱۹۸۶ء: ج ۲، ص ۷۶۸

۶۲۔ ایضاً: ج ۲، ص ۷۶۹